© rasailojaraid.com

دلائل السنن و الآثار

(۶)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

روایت معنعن معنعن اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ایک راوی اوپر کے راوی سے بلفظ عن روایت کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ یہ روایت میرے پاس فلاں شخص سے آئی ہے۔ اس میں یہ بات نہیں کھلتی کہ اس نے اُس سے خود حدیث سنی ہے یا بیچ میں کوئی راوی اور ہے جس کا نام نہیں دیا گیا۔ اسی لیے معنعن روایت میں تدلیس یا ارسال کا شبہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لفظ عن و قال کا استعمال اکثر ارباب فن کے نزدیک مطلق اجازت و انصال کے لیے ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تدریب میں ہے کہ "اس زمانہ میں عن کا استعمال بکثرت اجازت کے معنی میں ہوا ہے مثلاً اگر کوئی کہے کہ قرأت علی فلان عن فلان تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس سے روایت کرنے کی اجازت رکھتا ہے۔" امام نووی فرماتے ہیں کہ "اس زمانہ میں عن کا استعمال زیادہ تر اجازۃ کے لیے ہوتا ہے، پس جب محدثین میں سے کسی نے کہدیا کہ قرأت علی فلان عن فلان تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس سے بطور اجازت روایت کی ہے۔"

اسی بنا پر جمہور کا مذہب ہے کہ اَن مثل عن انصال کے لیے موضوع ہے لہٰذا جو راوی شیخ کا معاصر ہو اور بلفظ عن شیخ سے روایت کرے اسکی روایت سماع پر محمول ہوگی بشرطیکہ مدلس نہ ہو۔ بعض کے نزدیک لفظ عن کے ساتھ ایک ہم عصر شخص کی روایت اس شرط سے سماع پر محمول کی جائیگی کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں کی ایک بار ملاقات ثابت ہو تاکہ بلفظ عن روایت کرنے میں مرسل خفی کا جو احتمال ہے وہ رفع ہو جائے۔ علی بن المدینی اور امام بخاری وغیرہ ناقدین فن کا یہی مذہب ہے۔ بہر حال مطلق احتمال سماع کوئی چیز نہیں جب تک کہ واقعی راوی اور مروی عنہ میں ملاقات اور سماع ثابت نہ ہوں اور راوی تدلیس نہ کرتا ہو۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے نہایت عمدہ بات فرمائی ہے کہ حروف الفاظ وغیرہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا ملاقات، ہم نشینی، سماع، مشاہدہ وغیرہ کا ثبوت ہے یا نہیں۔ اگر تاریخاً ثابت ہے تو محض اس بنا پر حدیث رد نہیں کی جاسکتی کہ وہ مقررہ اصطلاحی الفاظ کے ساتھ روایت نہیں کی گئی ہے۔ ہاں اگر یہ ثابت نہ ہو تو بلاشبہ احتمال لقار و سماع عدم لقار و سماع سے بدل جائیگا اور روایت مردود ہوگی۔ نیز یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ جب کوئی روایت صحابی لفظ عن یا اَن اور قال یا سمعت سے بیان کردے تو تمام سلسلہ متصل سمجھا جاتا ہے، محض اس وجہ سے کہ صحابی کی عدالت و ثقاہت متفق علیہ ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ائمہ فن و ارباب کمال جو تدلیس نہ کرتے ہوں ان کی روایت میں لفظ عن وغیرہ اجازت پر محمول ہو گا اور روایت قبول ہوگی۔ حضرت امام بخاریؒ سے کسی نے ایک مرتبہ ایک حدیث کے متعلق سوال کیا جس میں تدلیس ہونے کا گمان تھا۔ آپ نے فرمایا "کیا تم کو گمان ہے کہ میں تدلیس کرتا ہوں، حالانکہ میں نے اسی تدلیس کے شبہ پر ایک شخص کی دس ہزار حدیثیں ترک کردیں، اور اسی قدر نہیں بلکہ اس سے زائد" چنانچہ ایسی بہت مثالیں موجود ہیں کہ امام بخاریؒ نے اسی شبہ پر بہت سے لوگوں کی روایتوں کو ترک کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مثال پیش نظر رکھنی چاہیے۔ امام علی رضا رضی اللہ عنہ ایک حدیث اس سند کے ساتھ روایت فرماتے ہیں: حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیہ جعفر الصادق عن ابیہ محمد الباقر عن ابیہ علی زین العابدین عن ابیہ شہید کربلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عن ابیہ علی المرتضٰی ۔ امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اگر یہ سند کسی مجنون کے سامنے پڑھی جائے تو اس کا جنون دور ہو جائے" یعنی یہ اتنی قوی سند ہے کہ اس کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ اب غور کیجیے کہ یہ پورا سلسلۂ سند معنعن ہے۔ اگر روایت کا معنعن ہونا مطلقاً صحتِ روایت اور رفع و اتصال کے منافی ہوتا تو یہ روایت ناقابلِ اعتبار ہوتی۔ مگر اس میں تدلیس کا کوئی قائل نہیں۔

تدلیس کے سیاسی اسباب بسا اوقات نہایت مستند و معتبر لوگوں کو بھی محض سیاسی اسباب کی بنا پر بظاہر تدلیس سے کام لینا پڑا ہے۔ مثلاً حسن بصریؒ جو بنی امیہ کے ظالمانہ دور میں تھے، اپنی روایات میں حضرت علی کا نام نہیں لیتے اور ان کا واسطہ چھوڑ کر حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس راز کو جو لوگ سمجھتے تھے وہ بے دیکھے بھالے تدلیس کا الزام عائد کر دینے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن المدینیؒ فیصلہ کرتے ہیں کہ حسن بصریؒ سے مرسلؔ روایت اگر ثقات کے واسطہ سے آئی ہو تو وہ صحاح کے حکم میں ہے۔

اصل یہ ہے کہ کوفہ و بصرہ یہ دو اسلامی شہر حضرت عمر فاروقؓ کے ایماء سے آباد کرائے گئے تھے جنکی خاک سے امام اعظمؒ، قاضی ابو یوسفؒ، حسن بصریؒ، مالک بن دینارؒ، ابن سیرینؒ، خلیل صاحب عروض وغیرہم اکابر رجال پیدا ہوئے۔ حرمین شریفین کے بعد ان ہر دو شہروں کو وسعت علم اور اشاعتِ حدیث کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے، اور انہیں دار العلوم کا لقب دیا گیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے اسلام کے دوسرے تیسرے دور میں جن لوگوں کو حاملین حدیث کا لقب دیا ہے اور ان کے مستقل تراجم لکھے ہیں ان میں مسروق بن الاجدع، قتادہ، شعبہ وغیرہم فن حدیث کے امام اسی سرزمین کے رہنے والے یا نزیل تھے۔ لیکن یہ ایک علمی اور تاریخی حقیقت ہے کہ اہلِ حجاز، حرمین، مصر، عوالی، خراسان، جبال، اصبہان، بلاد فارس، خوزستان اور ماوراء النہر میں شاید ہی کوئی امام تدلیس پیدا ہوا ہو، اس کے برعکس کوفہ اپنے سیاسی و مذہبی سنگم کی وجہ سے تدلیس کا مرکز تھا۔ تھوڑے سے لوگ بصرہ کے تھے، البقیہ کل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے کل کوفہ کے رہنے والے ایک مستقل سیاسی دنگل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح کے مذہبی و سیاسی فتنے خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کے وقت سے شروع ہوئے۔ پھر مسلمانوں کی باہمی آویزش مروان و حجاج وغیرہ کی صورت میں رونما ہوتی ہے اور فرق باطلہ کا زور بڑھتا ہے۔ کلامی مباحث جزو زندگی بن جاتے ہیں۔ حجاج بن یوسف جیسے ظالموں کے خوف سے صدہا اشخاص و رجال جنکی عظمتِ علمی و جلالت مذہبی مسلم تھی، یاس و قنوط کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ یہی اسباب تھے کہ سرزمین کوفہ تدلیس کا اکھاڑا بنگئی۔ رجال و طبقات کی کتابوں کی ورق گردانی کرو اور پھر اسوقت کی اسلامی تاریخ کا جائزہ لو تو محدثین کے اس قول کا صحیح مطلب تم پر واضح ہو جائیگا کہ "سب سے زیادہ تدلیس کرنے والے محدث کوفہ کے ہیں اور بصرے کے ان سے کم۔"

مثال کے طور پر واقعہ ذیل کو سامنے رکھو۔ امام حسنؒ بصری حضرت عمر فاروقؓ کی ختمِ خلافت سے ۲ سال قبل پیدا ہوئے۔ آپ کی تحنیک خلیفۂ دومؓ نے فرمائی، اور حضرت عثمان غنیؓ کی حیات تک مدینہ رہ کر بصرہ چلے گئے۔ اس وقت آپکی عمر ۱۴ سال کی ثابت ہوتی ہے۔ اتنی بڑی عمر تک آپ کا مدینہ میں رہنا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شرف ملاقات حاصل نہ کرنا قیاس میں نہیں آسکتا۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنی روایات میں حضرت علی کا حوالہ نہیں دیتے اور براہِ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلفظ عن روایت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ خود انہوں نے اپنے شاگرد یونس بن عبید سے بیان کردی ہے۔ یونس بن عبید نے پوچھا کہ آپ قال رسول اللہ صلعم کہتے ہیں حالانکہ آپ نے آنحضرت صلعم کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ عزیزم تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایسے زمانہ میں ہوں جو حجاج ظالم کا زمانہ ہے۔ میں حضرت علی کا نام لینے کی طاقت نہیں رکھتا[1]۔ اس لیے جب میں قال رسول اللہ کہوں تو جان لو کہ درمیانی واسطہ حضرت علی ہیں۔

---

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۶۶ والکوکب الدری صفحہ ۱۰۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قابل توجہ بات ہے کہ جب حسنؒ بصری خود اس سبب کو بیان فرما رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سرے سے حضرت علی کے ساتھ انکی ملاقات کا انکار کیا جائے۔ خود محدثین کی ایک جماعت مدینہ میں حضرت علی سے ملنے کی قائل ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت حسنؒ نے حضرت علی کو دیکھا تو ضرور ہے۔ مگر پھر کہتے ہیں کہ حضرت علی سے آپ کا سماع ثابت نہیں۔ عجیب تماشہ ہے کہ دیکھنا تو ثابت ہے مگر باوجود اسکے کہ ملاقات ہوتی ہے اور اس وقت حسنؒ بصری کی عمر بھی ۱۵ سال بتصریح ائمۂ رجال ثابت ہوتی ہے پھر بھی انکی روایت قبول کرنے میں قیل و قال سے کام لیا جاتا ہے حالانکہ محدثین کے اصول کے مطابق ایک مرتبہ بھی لقاء ثابت ہو جائے تو تمام روایات معنعنہ اتصال و سماع پر محمول ہونگی۔ اسی بنا پر علامہ سیوطیؒ سماع و لقاء دونوں کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "اثبتہ جماعۃ وھو الراجح عندی بوجوہ" یعنی ایک جماعت نے اسکو ثابت کیا ہے اور یہی میرے نزدیک متعدد وجوہ سے راجح ہے"۔ ان وجوہ کو ایک رسالہ کی صورت میں علامہ شیخ محمد یحیی الہ آبادی معروف بہ شاہ خوب اللہ نے جمع کیا ہے۔

تنقید رواۃ کے بارے میں خلاصۂ کلام اگر کسی راوی کے متعلق مختلف ناقدین کی مختلف رائیں ہوں تو ان رایوں میں سے کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کے لیے حسب ذیل امور پر نظر کی جائیگی :-

(۱) معاصر ناقدین کی اکثریت کدھر ہے ؟

(۲) مختلف رتبوں کے ناقدوں میں سے اعلیٰ درجہ کے مستند ناقدین کس طرف ہیں ؟

(۳) عام ناقدین کی اکثریت کس طرف مائل ہے ؟

اسی طرح کسی راوی کے متعلق متاخر عہد کے غیر معاصر ناقد جب اپنی رائے دیتے ہیں تو اس کی بنیاد حسب ذیل چیزوں پر ہوتی ہے :-

(۱) راوی کی موجودہ روایات کے ذخیرہ کی نوعیت کیا ہے اور زیادہ تر اس میں معروف یا منکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کس قسم کی باتیں ملتی ہیں ؟

(۲) دوسرے مستند لوگوں کے بیانات سے اس کا بیان کہاں تک موافق یا مخالف ہے ؟

(۳) اس مختلف فیہ راوی کے معاصر فضلا کی رائیں اس کے متعلق کیا ہیں اور اگر وہ مختلف ہیں تو ان میں مشہور و معروف ناقدین کدھر ہیں یا ان کی کثیر تعداد کس جانب ہے ؟

(۴) متاخر ناقد نے گو خود اس راوی کو نہیں جانچا مگر اس کے متعلق اس نے اپنے شیوخ کی زبان سے کیا سنا ہے جو اس راوی کے معاصر تھے ؟

یہاں یہ طالب علمانہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ جب سنن و آثار نبوی کی تصحیح و تضعیف وغیرہ کا مدار حسّی امور پر ہے جس میں کسی اجتہاد کو دخل نہیں تو پھر بعض حدیثوں کی صحت و سقم میں اختلاف کیوں ہے اور محدثین کی رائیں رواۃ کے بارے میں متضاد کیوں ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف کے چند وجوہ ہیں :-

(۱) ایک حدیث کی دو سندیں ہیں - ایک ضعیف - دوسری صحیح - دو محدثین میں سے ایک کو وہی حدیث بسند ضعیف پہنچی دوسرے کو بسند صحیح -

(۲) دونوں کو ایک ہی سند ضعیف سے حدیث پہنچی لیکن ایک کو اسکی تائید میں دوسرے شواہد مل گئے اس لیے اس نے اسے صحیح کہا - دوسرے کو نہیں ملے لہٰذا اس نے تصحیح سے انکار کر دیا - محدثین کی اصطلاح میں حسن لذاتہٖ اور حسن لغیرہٖ کے یہی معنی ہیں - حسن لذاتہٖ وہ ہے جو خود اپنی سند کے اعتبار سے حسن ہو - حسن لغیرہٖ وہ ہے جس کو کسی دوسرے تائیدی بیان نے حسن بنا دیا ہو -

(۳) یا دونوں کو شواہد ملے مگر تضعیف کرنے والے نے اس خاص سند یا اس خاص متن کے اعتبار سے اس کو ضعیف کہا - چنانچہ جامع ترمذی کے متن میں ایسی حدیثوں کی تضعیف یوں کی گئی ہے کہ "غریب بھٰذا اللفظ " - یعنی ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث غریب ہے -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) یا کسی امام کی جرح کسی راوی پر دیکھ کر حدیث کی تضعیف کی گئی حالانکہ جرح کرنے والے نے اس جرح سے رجوع کر لیا تھا جس کی اطلاع تضعیف کرنے والے کو نہیں ہوئی۔

(۵) کبھی ایک ہی امام نے کسی راوی کے حالات کا پتہ لگایا۔ اس وقت اس میں کوئی امر قادح نہ تھا۔ پھر آگے چل کر اس نے اپنی حالت بدل دی اس لیے پھر اسی امام نے جرح کر دی۔ تلامذہ میں سے کچھ لوگوں نے تعدیل سنی اور دوسروں نے جرح۔ جس نے جو کچھ سنا وہی روایت کر دیا۔

(۶) کبھی کسی راوی کا ایک امام کو مفصل حال معلوم نہ ہو سکا یا جہاں تک معلوم ہوا کوئی امر قادح نہیں تھا۔ لیکن دوسرے امام نے جا کر اچھی طرح اس کے حالات تحقیق کیے، لہٰذا اس راوی میں وہ باتیں پائیں جو قابل جرح تھیں اس لیے اس دوسرے امام نے جرح کر دی۔

یہ سب امور قابل غور و تدبر ہیں۔ جس شخص کو احکام دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے مستفید ہونے کی لگن لگی ہوئی ہو وہ تو مجبوراً ان امور کی تحقیق میں سر کھپائیگا۔ مگر جو لوگ نبی کی ہدایت سے بے پرواہ ہیں وہ کہدینگے کہ کون مغز پاشی کرے۔ حدیث کے اس سارے ذخیرے کو آگ ہی کیوں نہ لگا دو۔

تقسیم احادیث محدثین رحمہم اللہ نے احادیث کے ذخیرہ کو دو بڑی اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جن کا تعلق حرام و حلال کی حدود اور عبادات کے احکام اور تمدنی معاملات کے قواعد و ضوابط سے ہے۔ دوسری وہ احادیث جو فضائل و مناقب اور اخبار غیب اور ثواب و عقاب اور قصص الاولین وغیرہ امور سے تعلق رکھتی ہیں۔

پہلی قسم کی احادیث میں حضرات محدثین بڑی چھان بین اور تحقیق و تنقید سے کام لیتے ہیں کیونکہ ان پر لوگوں کے اخلاق و اعمال کی صحت کا دار و مدار ہے۔ رہیں دوسری قسم کی احادیث تو ان میں عموماً انہوں نے سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ چنانچہ حضرات ابن مہدیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے صاف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصریح فرمادی ہے کہ :۔

اذا رویناعن النبی صلعم فی الحلال والحرام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سہلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال ۔ [1]

یعنی جب ہم آنحضرت صلعم سے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں۔ لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری سے اور راویوں کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ سنن وآثار نبوی جن کا تعلق احکام وغیرہ سے ہے، ان کے بارے میں محدثین نے کوئی امر وافتہ نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگر انہیں حضرات کی تصریحات کے مطابق دیکھا جائے تو خود روایات میں معمول بہا وغیر معمول بہا کی تمیز کا ایسا قوی اور مستحکم اصول ہاتھ آجاتا ہے جو روز روز کے فرسودہ اور با زہر ہوا خیالات کا استیصال کلی طور پر کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اصول وہی قابل اعتماد ہوگا اور ہونا چاہیے جو عقل صریح ونقل صحیح کے مخالف نہ ہو بلکہ اسی سے ماخوذ ہو۔ جو بات جس نوعیت کی تھی ویسے ہی اس کے متعلق تحقیق وجستجو کے اصول بھی بنائے گئے۔ یہیں سے یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ سنن وآثار نبوی پر جو کتابیں لکھی گئیں جیسے صحاح ستہ، اور سیر وتاریخ نبوی پر جتنی کتابیں لکھی گئیں مثلاً ابن ہشام وطبقات ابن سعد وغیرہ، ان میں کتب حدیث کا جو مرتبہ ہے وہ کتب سیرت کا نہیں ہے۔ اسی طرح ترغیب وترہیب، فضائل اعمال وفضائل قرآن، اسرائیلی روایات تفسیر اور ملاحم ومغازی کے بارے میں محدثین کی شہادتیں ہیں کہ ان میں اکثر ناقابل وثوق ہیں۔ ہاں فضائل قرآن میں صرف سورۂ فاتحہ، زہراوان، انعام، سبع طوال، کہف ویٰسین، دخان، ملک، زلزلہ، نصر، کافرون، اخلاص، معوذتین

---

[1] فتح المغیث وغیرہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے متعلق روایات صحیح موجود ہیں، "و ماعداھا لم یصح فیھا شیٔ"[۱]۔

سنن و آثار اور احادیث و اخبار علماء اصول کے نزدیک تھوڑے سے ہیر پھیر کے بعد ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔ بعض فروری اور اصولی فروق کو مجملاً لکھا جاتا ہے۔

سنت و اثر | سنت کے معنی لغت میں دوام اور طریقہ مسلوکہ و محمودہ وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں سنت نام ہے نبی اکرمؐ کے قول فعل اور تقریر کا۔ لیکن اہل لغت و اہل حدیث کے نزدیک عام معنی کے لحاظ سے واجب وغیر واجب سب پر سنت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ حدیث کا کا مرادف ہے۔ اگرچہ بعض محدثین لفظ حدیث کو محض آنحضور صلعم کے قول تک محدود رکھتے ہیں لیکن عموماً اس کا استعمال وسیع معنوں میں ہوتا ہے بلکہ بعض محدثین تو موقوف[۲] پر بھی احادیث کا اطلاق کرتے ہیں۔ اس تعریف کی رو سے ایک بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض اکابر محدثین کے متعلق مشہور ہے کہ انھیں سات لاکھ یا اس سے کم و زاید احادیث محفوظ تھیں، درانحالیکہ احادیث صحیح و مرفوع کا اتنا سرمایہ کبھی بھی موجود نہ تھا اور نہ اب ہے۔ لہٰذا اسکا مطلب یہی ہے کہ اس تعداد میں آثار و سنن، مرفوع و موقوف، تفسیر و مغازی سبھی ابواب داخل تھے۔ دیکھو امام حافظ ابو زرعہ کے متعلق حافظ ابو بکر محمد بن عمر الرازی کا قول ہے کہ "ابو زرعہ کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں جن میں ایک لاکھ چالیس ہزار صرف تفسیر سے متعلق تھیں"۔

اہل فقہ کی اصطلاح میں سنت کا اطلاق واجب پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکا استعمال اکثر بدعت کے مقابل ہوا کرتا ہے۔ اسکی دو قسمیں کی گئی ہیں (۱) سنت ہدیٰ جسکا تارک مستحق لوم و زجر قرار دیا گیا ہے جیسے صلوٰۃ عیدین، اذان، اقامت، نماز جماعت، سنن رواتب وغیرہ (۲) سنن زوائد، جن کا

---

[۱] تدریب۔

[۲] موقوف اس روایت کو کہتے ہیں جسکی سند صحابی پر پہنچ کر ٹھہر گئی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تارک مستحق ملامت نہیں، جیسے تطویل ارکان صلوٰۃ وغیرہ۔ تفصیلی بحث کتب اصول فقہ میں ملاحظہ ہو۔
حنفیہ کی اصطلاح میں سنت اس کو کہتے ہیں جسے آنحضرت صلعم نے ہمیشہ کیا ہو، البتہ کبھی کبھی ترک بھی کر دیا ہو۔

بعض اکابر محدثین نے جو احادیث کے مجموعے مرتب کیے ہیں ان کو لفظ "سنن" سے تعبیر کیا ہے، جیسے سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، سنن دارقطنی، سنن سعید بن منصور، سنن ابی مسلم الکشی، سنن کبریٰ بیہقی وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ لفظ سنت کو بہت وسیع معنوں میں لیتے تھے۔

آثار کا اطلاق علماء اصول کے نزدیک مرفوع [۵] اور موقوف دونوں پر ہوتا ہے۔ ادعیۂ ماثورہ اسی وجہ سے کہی جاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق مرفوع ثابت ہیں۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار اور مشکل الآثار اپنی کتابوں کے نام رکھے ہیں اور ان میں آثار صحابہ کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلعم کی مرفوع حدیثوں کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ علامہ سخاویؒ کا قول ہے کہ امام طبرانیؒ کی کتاب تہذیب الآثار محض مرفوع روایات کے ساتھ مخصوص ہے، موقوفات وغیرہ تبعاً ذکر کر دیگئی ہیں۔ البتہ فقہاء خراسان کی اصطلاح یہ ہے کہ وہ لفظ اثر کو صرف موقوف احادیث کے لیے مخصوص کرتے ہیں، اور خبر کا لفظ مرفوع احادیث کے لیے بولتے ہیں۔ تہذیب الآثار طبری، معرفۃ السنن و الآثار بیہقی، الاعتبار فی الناسخ و المنسوخ من الآثار علامہ حازمی، آثار امام محمدؒ وغیرہ اسی مناسبت سے مرتب و مدون ہوئی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سنن و آثار، اخبار و احادیث کے مفہوم میں اہل علم کے نزدیک بولے جاتے ہیں۔

---

۵ مرفوع وہ حدیث ہے جس کا سلسلہ روایت آنحضور صلعم تک پہنچتا ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدیث و خبر

آج کل کے جہلاء حدیث کو ناقابل اعتبار ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی بعض آیتوں سے عجیب قسم کا مضحکہ خیز استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے "اس قرآن کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے؟" وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ کا ترجمہ اس سے بھی زیادہ پر لطف ہے۔ یا تو یہ لوگ جان بوجھ کر قرآن میں تحریف کرتے ہیں۔ یا یہ اتنے جاہل ہیں کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ قرآن میں لفظ حدیث اُن اصطلاحی معنوں میں نہیں آیا ہے جن میں محدثین اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ تاہم اگر انہیں اس پر اصرار ہے کہ قرآن مجید میں لفظ حدیث سے حدیث نبوی ہی مراد ہے تو کیوں نہ آیات ذیل کو منکرین حدیث کے لیے شدید ترین وعید قرار دیا جائے؟ أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ۔ فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ۔ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ۔ مَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا۔
وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ ضحیٰ میں اپنے احسانات عظیمہ کا ذکر کیا ہے جو آنحضرت صلعم پر خود بدولت نے فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ تم یتیم تھے، ہم نے تمہاری خبرگیری و پشت پناہی کی۔ دوسرے یہ کہ تم تنگ دست تھے۔ ہم نے تمہیں خوشحال کیا۔ تیسرے یہ کہ تم راہ راست سے بے خبر تھے، ہم نے تمہیں ہدایت بخشی۔ اس کے بعد ہر احسان کے جواب میں اس کے مناسب حال شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ پہلے احسان کا شکریہ یہ ہے کہ یتیم پر قہر نہ کرنا۔ دوسرے احسان کا شکریہ یہ ہے کہ سائل کو کبھی نہ دھتکارنا۔ اور تیسرے احسان کے شکریہ کی صورت یہ بتائی کہ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ یعنی یہ علم ہدایت کی نعمت جو ہم نے تم کو بخشی ہے اس کا چرچا کرو، اسے پھیلاؤ، اس کو کھول کھول کر بیان کرو۔ اس حکم کی تعمیل میں جو تحدیث نعمت آنحضور صلعم نے کیا اسی کا نام حدیث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے - پس اگر ہمارے دوستوں کو قرآن ہی سے حدیث کی حیثیت معلوم کرنی تھی تو سورۂ ضحیٰ کو کیوں نہ ملاحظہ فرمایا؟

اصل یہ ہے کہ حدیث کے معنی بات کے ہیں اور یہ لفظ اپنے اندر بہت بڑی وسعت رکھتا ہے کسی شخص کا قول - مدعا - حکایت - خبر - ان سب معانی کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے - مقامات بدیع الزمان ہمدانی کوئی حدیث کی کتاب نہیں ہے بلکہ ادب اور حکایات کی کتاب ہے - اس میں بھی مصنف لفظ حدثنا عیسیٰ ابن ہشام کے ساتھ حکایت نقل کرتا ہے - پس یہ ایک عام لفظ ہے - اگر اس کی نسبت کسی مورخ یا قصہ گو کی طرف ہوگی تو اس سے مراد تاریخی روایت یا افسانہ کی حکایت ہوگی اور اگر اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوگی تو اس سے اللہ کی باتیں مراد ہونگی - اور اگر رسول کی طرف یہ لفظ منسوب ہوگا تو اس سے مراد رسول کی گفتگو اور آپ کے حالات ہونگے -

عرف شرع میں حدیث سے مراد وہ چیز ہے جسکی نسبت آنحضرت صلعم کی طرف کی جائے - اسی لیے جمہور علماء اصول کا مذہب ہے کہ خبر، اثر، سنت یہ سب حدیث کے مرادف ہیں[۱] - البتہ بعض کا قول ہے کہ جو آنحضرت صلعم سے مروی ہو وہ حدیث ہے اور جو غیر سے مروی ہو وہ خبر ہے - اسی تفریق کے لحاظ سے مورخ و قصہ گو کو اخباری اور خادم سنت کو محدث کہا جاتا ہے - بعض نے دونوں میں عموم و خصوص کی نسبت بیان کی ہے، یعنی جو حدیث ہے وہ خبر ہے اور خبر کے لیے حدیث ہونا ضروری نہیں ہے[۲] -

---

[۱] اصول الحدیث للبرکوی - [۲] شرح نخبہ و توجیہ النظر وغیرہ،

© rasailojaraid.com